یقیناً عالم کفر میں اس اسلامی اتحاد کے خلاف میٹنگیں منعقد ہوں گی، سازشیں کی جائیں گی۔ اور وہ اپنی چوہدراہٹ کھوتی ہوئی محسوس کر کے عالم اسلام میں انتشار وافتراق کو دوبارہ ہوا دینے کے لیے ہر حیلہ اختیار کریں گے۔ لہٰذا عالم اسلام کے حکمرانوں کو اس محاذ پر انتہائی محتاط رہ کر غیرتِ ایمانی کا عملی ثبوت دینے کی شدید ضرورت ہوگی۔ غرض ایک شدید سرد جنگ برپا ہوگی، جس میں متحدہ اسلامی ممالک کے سربراہان ثابت قدمی دکھائیں، تو رحمتِ الٰہی سے ان کی ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ بفضل الٰہی اس کے ثمرات وبرکات کو دیکھ کر یکے بعد دیگرے باقی تمام اسلامی ممالک بھی خلوص کے ساتھ برضا ورغبت اس اتحاد میں شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح ان شاء اللہ عالم اسلام دنیا کی زبردست سپر پاور بن جائے گا۔ رب تو مائل بہ کرم ہے، سائل بن کر دکھائیں تو سہی۔

بحالیِ عظمتِ رفتہ ہمارا ہی حق ہے، اور یہی اللہ رب العزت کی منشائے مبارک بھی ہے۔ دیر صرف اس بات کی ہے کہ ہم اس عظمت وشان کے اہل بن جائیں: ﴿هُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝﴾ [التوبۃ ۳۳، الصف ۹]

''وہی ذات عظیم ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچا دین عنایت فرما کر رسالت سے نوازا، تاکہ اسے تمام ادیانِ عالم پر غلبہ عطا فرمائے، اگرچہ مخلوق پرستوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

سورۃ الفتح میں اسی مبارک مضمون پر اپنی شہادت کی مہر بھی لگا دی ہے: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ۝﴾ [الفتح ۲۸]

''......اور اس حقیقت پر گواہی کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فوجی اتحاد کو عالم اسلام کے لیے خصوصاً اور عالم انسانیت کے لیے عموماً امن وسلامتی اور دین ودنیا کی بھلائیوں کو سمیٹنے کا ذریعہ بنا کر اس میں اپنے فضل وکرم سے برکت اور استقلال عطا فرمائے۔ اہل اسلام کے عقائد واعمال کو کتابِ الٰہی اور سنت نبوی پر اکٹھا فرمائے۔ مسلم حکمرانوں کو جرأتِ ایمانی اور کمالِ مردانگی سے سرفراز فرما کر امت اسلامیہ کی کھوئی ہوئی عظمت وعزت کو بحال فرمائے اور اسے تا دیر قائم ودائم رکھے۔ آمین

درس قرآن مجید

تراثِ رحمانی در فوائد قرآنی

ڈاکٹر اسماعیل محمد امین

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○﴾ [سورة البقرة ٦٣-٦٤]

''اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور تمہارے اوپر طور پہاڑ کو بلند کیا کہ ہم نے تمہیں جو دیا ہے اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لو، اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو، تا کہ تم بچ جاؤ۔ پھر تم اس کے بعد پلٹ گئے، پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔''

سابقہ آیات مبارکہ سے ربط اور مختصر تفسیر:

سابقہ آیتوں کی طرح زیر تفسیر آیت مبارکہ میں بھی یہودیوں کی بدعملی اور عہد شکنی کی وجہ سے ان کی توبیخ اور سرزنش ہورہی ہے۔فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ ''اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے میثاق لیا تھا۔'' ﴿میثاق﴾ وثاق سے ہے، جو کہ قیدی کو مضبوط باندھنے والی رسی کو کہا جاتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ [سورة محمد ٤] ''جب یہ قیدی تمہارے ہاتھ آ جائیں تو تم انہیں مضبوطی کے ساتھ رسی سے باندھ دو۔'' اسی لفظ سے ''میثاق'' بنا ہے۔پس یہ انتہائی پختہ، مضبوط، بھاری اور تأکید والے عہد و پیمان کو کہا جاتا ہے۔اور عہد کی تأکید قسموں اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں سخت تخویف اور وعید کے ساتھ کی جاتی ہے۔

حضرت ابوالعالیہؒ سے جید سند کے ساتھ ثابت ہے کہ بنی اسرائیل سے لیا ہوا میثاق یہ تھا کہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے علاوہ دوسروں کی عبادت سے اعلانِ براءت کریں۔[التفسير الصحيح]

بنی اسرائیل سے لیے ہوئے ایک میثاق میں عقیدہ توحید کے علاوہ دیگر احکام بھی بیان کیے گئے ہیں: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا......﴾ [البقرة ٨٣]

لیکن بظاہر زیرِ تفسیر آیت میں مذکورہ میثاق ایک خاص نوعیت کا تھا، جس کی تفصیل اسی آیت کے اگلے حصے میں آئی ہے: ﴿خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ [۶۳]

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ﴾ اس واقعے کی تفصیل دوسری جگہ آرہی ہے: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَھُمْ کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ﴾ [الأعراف ۱۷۱] ''جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر لا کھڑا کیا گویا کہ وہ ایک سائبان ہو۔'' ﴿نَتَقْنَا الْجَبَلَ﴾ اور ﴿رَفَعْنَا﴾ دونوں سے یہ معنی واضح ہوتا ہے کہ پہاڑ کو اس کی اصل جگہ سے اٹھا کر ان کے سروں کے اوپر لا کر کھڑا کر دیا، ﴿کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ﴾ گویا وہ ان کے لیے سائبان کی طرح ہو گیا۔

امام شوکانی کہتے ہیں: بہت سارے مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تختیوں پر تورات لے کر بنی اسرائیل کے پاس پہنچے، تو یہودیوں نے اس پر عمل کرنے سے انکار کیا، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ تو اس پر انہیں بے ہوش کر دیا گیا۔

پھر ان سے دوبارہ تورات پر عمل کرنے کو کہا گیا، انہوں نے پھر انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ طور کو بلند کر دیا کہ گرا کر تمہیں کچل دیا جائے گا۔ اور ان کے سامنے آگ رکھی اور پیچھے دریا بھی تھا، جس سے ڈرتے ہوئے انہوں نے تورات پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ''رفع جبل'' کا یہ واقعہ ان کے مطالبے پر پیش آیا۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں پہاڑ کا نام صراحت کے ساتھ ''طور'' آیا ہے، جبکہ سورۃ الاعراف میں مطلقاً ''جبل'' کا ذکر ہے۔ مشہور قول کے مطابق وہی معروف پہاڑ ہے، جس پر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اسی کو ''ظاہر'' قرار دیا ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک ''طور'' سریانی زبان میں پہاڑ کو کہا جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک سرسبز پہاڑ کو طور کہا جاتا ہے۔ ان دونوں توجیہات کی روشنی میں ''طور'' سے مراد بھی مطلق پہاڑ ہے، نہ کہ وہی مخصوص پہاڑ مراد ہے۔ (الطُّور، الجَبَل کے معرفہ ہونے سے مخصوص پہاڑ مراد ہونا راجح لگتا ہے۔)

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ﴾ یعنی: ''فقلنا لکم: خُذُوْا'' ''ہم نے تمہیں حکم دیا کہ تھام لو۔''

﴿مَآ اٰتَیْنٰکُمْ﴾: أعطیناکم جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے۔ دوسری جگہ اس عطا کردہ چیز کی وضاحت آئی ہے: ﴿وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ ۵۳] یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتابِ ہدایت یعنی تورات عطا فرمائی تھی۔

﴿بِقُوَّةٍ﴾ میں (ب) مصاحبت کے لیے ہے، یعنی اسے مضبوط تھام لو۔ مفسرین سے اس ''قوت'' کے مختلف معانی منقول ہیں: اطاعت اور عمل کے ساتھ، انتہائی محبت کے ساتھ، پختہ ارادے اور عزم کے ساتھ، اپنے آپ پر نافذ کرتے ہوئے، سچی نیت اور اخلاص کے ساتھ۔ ان مذکورہ معانی میں کوئی تعارض نہیں ہے؛ بلکہ تمام معانی ایک دوسرے کے ساتھ متفق اور لازم وملزوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم تورات کو اچھی نیت، پختہ ارادے کے ساتھ قبول کرو۔ اس پر انتہائی محنت اور محبت کے ساتھ عمل کرو۔ اس میں بیان کردہ واجبات پر کمی بیشی کے بغیر پابندی کرو۔ اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں اس کے احکام کو نافذ کرو۔

﴿وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ میں (مَا) اسم موصول ہے، اور یہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی تورات میں جتنی بھی باتیں ہیں، سب کو یاد کرو۔ حضرت ابو العالیہؒ سے جید سند کے ساتھ مروی ہے: ''تم تورات کو مان لو اور اس پر عمل پیرا رہو۔'' حافظ ابن جریر طبریؒ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں: ''جو ہم نے تمہیں کتاب دی ہے اس میں موجود وعدے اور وعید اور ترغیب وترہیب سب کا خیال رکھو۔ اسے پڑھو، اس پر غور وفکر کرو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔''

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ لَعَلَّ تعلیل کے لیے ہے، یعنی اگر تم سابقہ امور پر عمل پیرا ہوں، تو متقی بننے کا شرف حاصل کرلو گے۔ یا تم اللہ کے عذاب سے بچ سکو گے۔ اس کی تفسیر سورۃ البقرۃ آیت (۲۱) کے درس میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ دیکھیے: التراث 10 / 4

﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ میں تَوَلّٰی بروزنِ: تَفَعَّلَ سے ماخوذ ہے۔ اور اصل میں جسمانی طور پر کسی چیز سے اعراض اور پیٹھ پیچھے کر لینے کو کہا جاتا ہے۔ پھر اسی معنی میں وسعت پیدا کرتے ہوئے دین اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور نظریاتی امور سے منہ پھیر لینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس سارے عہد وپیمان کے بعد انہوں نے بہت سی باتوں میں تورات سے کنارہ کشی اختیار کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے تورات میں تحریف کی۔ اس کی آیات کو چھپایا۔ انبیاء کرام کے احکام کی نافرمانی کی۔ بعض کو جھٹلایا، بعض کو قتل کر ڈالا۔ میدانِ تیہ میں عجیب وغریب نعمتوں کے مشاہدے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بار بار اعتراض کیے۔ ان کی حکم عدولی کی۔ انہیں سخت ایذا پہنچائی۔ ارض مقدس میں داخلے کا حکم دیا تو سب نے انکار کیا۔ حتیٰ کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے خود کو ان نافرمانوں سے الگ کر دینے کی دعا مانگی۔

یہ سب پہلوں کا حال تھا۔ بعد والوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ﴾ ذٰلِکَ اسم اشارہ ہے، اس کا مشار الیہ سابقہ امور ہیں۔ تمہاری طرف کتاب نازل ہونے اور انسانی تصور و سوچ سے زیادہ واضح اور سخت انداز میں تمہاری توبیخ اور تنبیہ کرنے کے باوجود یعنی طور پہاڑ کو تمہارے اوپر کھڑا کر کے تم سے توبہ کروانے کے باوجود تم نے روگردانی اور عہد شکنی کا راستہ اختیار کیا۔

﴿فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ﴾ اس میں لَوْلَا حرف امتناع لوجود ہے۔ یعنی کسی چیز کے وجود کی وجہ سے کسی چیز کے معدوم ہونے کا معنی بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت کے وجود کی وجہ سے تم نقصان اٹھانے سے بچ گئے۔ اسی لیے بعض علماء نے ﴿فَضْلُ اللّٰهِ﴾ مبتدا کی خبر موجوْدًا یا تَدَارَكَكُمْ مقدر مان لیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل موجود نہ ہوتا، یا اللہ تعالیٰ کا فضل تمہیں نہ پالیتا۔

﴿وَرَحْمَتُهٗ﴾ یہ ﴿فَضْلُ اللّٰهِ﴾ پر عطف ہے۔ اور ''فضل'' واجب چیز سے زائد دینا ہے۔ اور اسی سے اِفضال ہے، جو دوسروں پر احسان کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ''رحمت'' سے مراد عفو و درگزری ہے۔ اسی سے زیر تفسیر آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بنی اسرائیل کے اعمالِ بد کا تذکرہ فرمایا۔ لیکن خطاب نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل سے کیا۔ اس کی وجہ میں بعض علماء کا بیان ہے کہ آخری زمانے کے یہودی بھی اپنے آباء و اجداد کے کرتوت پر خوش تھے؛ بلکہ اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کے عہد و پیمان کو توڑنے کے بعد طور پہاڑ کو ان کے اوپر کھڑا کر کے سخت تنبیہ فرمائی، پھر انہیں بچا کر توبہ کا موقع عطا فرمایا۔ اور ان کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل فرمائیں اور انبیاء مبعوث فرمائے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس فضل اور رحمت سے مراد بعثتِ محمدی اور عہد شکنی سے مراد نبی ﷺ پر ایمان نہ لانا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی بعثت طیبہ کی برکت سے یہ امت بشمولِ کفار کے دنیاوی حد تک عذابِ عام سے محفوظ ہیں۔

حضرت ابو العالیہؒ سے مروی ہے کہ فضل اللہ سے مراد ''اسلام'' اور رحمت الٰہی سے مراد ''قرآن مجید'' ہے۔

﴿لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ لولا کا جواب ہے۔ اس لیے کہ اس میں ''لا'' آیا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ